شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے ترجمہ قرآن کریم کا تحقیقی تجزیہ

حافظ زاہد علی ☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عرب میں ہوئی اور آپ پر جو کتاب ''قرآن'' کے نام سے نازل کی گئی، وہ بھی عربی زبان میں تھی۔ جوں جوں اسلام سرزمین عرب سے نکل کر دوسرے غیر عربی علاقوں میں داخل ہوا، تو وہاں کے علما نے قرآن حکیم کو اپنی زبان میں ترجمہ کرنا ضروری سمجھا تاکہ عوام اور وہ لوگ بھی اس سے براہ راست مستفیض ہو سکیں جو عربی زبان سے ناآشنا ہیں۔ اسلام ایران میں داخل ہوا تو قرآن حکیم کا فارسی میں ترجمہ ہوا، اور جب اسلام ہندوستان میں داخل ہوا تو قرآن حکیم کے ترجمہ کا کام بھی ساتھ ہی شروع ہو گیا، تاکہ عوام النّاس اس کو سمجھ کر اپنے اعمال کو اس کے مطابق بنائیں.

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اردو کو پہلے ''ہندی'' کہتے تھے۔ جب فارس کی زبان فارسی تھی تو ہندوستان کی زبان ہندی ہونی چاہیے۔ اردو کا نام اس زبان کو بعد میں دیا گیا ہے جب مختلف زبانوں کے الفاظ اس میں داخل کیے گئے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری کے مشہور سیاح بزرگ ابن شہریار نے اپنے سفرنامہ ''عجائب الہند'' میں قرآن حکیم کے ایک ترجمہ کا ذکر کیا ہے جو کشمیر کے راجہ مہروک کے کہنے پر تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستانی زبان میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''کشمیر کے راجہ مہروک نے ۲۷۰ھ/۸۸۳ء میں منصورہ (سندھ) کے حاکم امیر عبداللہ بن عمر کو لکھا کہ میرے پاس ایک ایسا آدمی بھیج دیا جائے جو اسلامی شریعت کے احکام ہندی زبان میں بیان کر سکے۔ امیر عبداللہ نے ایک مسلمان عالم کو بھیجا جو ہندوستان کی مختلف

☆ لیکچرار، شعبہ عربی، گورنمنٹ کالج شیخوپورہ
طالب علم پی۔ایچ۔ڈی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

زبانیں جانتا تھا۔ اس نے راجہ کے پاس چند سال ٹھیر کر راجہ کو پورے طور پر اسلام سے واقف بنا دیا۔ راجہ نے اس سے یہ خواہش کی کہ وہ ''ہندی'' زبان میں میرے لیے قرآن کی تفسیر کر دے۔ سورۃ یٰسین تک یہ تفسیر مکمل ہوگئی تھی۔''(۱)

اسی طرح شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہؒ نے بھی ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں اپنے ترجمہ قرآن حکیم کے دیباچہ میں لکھا ہے:

''اس بندہ عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بہت بڑے حضرت شاہ ولی اللہ عبدالرحیم کے بیٹے، سب حدیثیں جاننے والے، ہندوستان کے رہنے والے، فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے ہیں اسی طرح عاجز نے ''ہندی زبان'' میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے۔ الحمدللہ یہ آرزو ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں حاصل ہوئی۔''(۲)

ان دو اقتباسات سے مقصد یہ ہے کہ ایک تو اردو کو پہلے ہندی کہا جاتا تھا کیونکہ یہ ہندوستان کی زبان تھی اور دوسرے یہ کہ ہندوستان میں قرآن حکیم کا ہندی میں ترجمہ اسلام کے ہندوستان میں داخل ہونے کے وقت ہی سے شروع ہوگیا تھا، جن میں سے ایک ترجمہ وہ ہے جس کا ذکر ابن شہریار نے راجہ مہروک کے حوالہ سے کیا ہے۔ ان سب ترجموں کا ذکر تو ہم نہیں کر سکتے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں قرآن حکیم کے کئی ترجموں کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے کچھ تراجم مطبوعہ ہیں اور کچھ تراجم کے مخطوطات مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں.

مغل بادشاہوں میں شاہ عالم بادشاہ ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء تا ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء کا عہد حکومت قرآن حکیم کے اردو ترجموں کے لیے قابل ذکر ہے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اپنے اردو ترجموں کا کام اسی زمانہ میں کیا.

بادشاہ شاہ عالم کے ایما سے حکیم شریف خان ابن حاذق ملک حکیم محمد اکمل خان دہلوی (م: ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء) نے قرآن حکیم کے اردو ترجمہ کی تکمیل کی۔ یہ ترجمہ افسوس ہے کہ چھپا نہیں، لیکن اس کا مخطوطہ ابھی شریفی خاندان میں محفوظ ہے، جس کا ذکر مقدمہ شرح خمیات حکیم شریف خان میں موجود ہے۔ مخطوطہ میں ترجمہ کے اختتام کا دن اور تاریخ تو ہے، لیکن سال نہیں لکھا ہوا۔ شاید حکیم محمد

شریف خان مرحوم لکھنا بھول گئے ہوں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ ترجمہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس لیے کہ حکیم محمد شریف خان کا انتقال انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوا، یہ مخطوطہ کتب خانہ حکیم محمد احمد خان بمقام دہلی میں موجود ہے۔

اس ترجمہ قرآن کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے:

''اس (ترجمہ) کی زبان شاہ عبدالقادر مرحوم کے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں اتنی سختی نہیں کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ نیز شاہ صاحب کی طرح ہندی میں نہیں ہے۔''

ڈاکٹر عبدالحق کی اس رائے سے اہل علم نے بہت اختلاف کیا ہے، بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ پر تنقید کرنے میں دھاندلی سے کام لیا ہے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ حکیم شریف خان صاحب کے ترجمہ سے کوئی دس سال پہلے لکھا گیا لیکن یہ ترجمہ نہایت شستہ اور فصیح ہے۔ شاہ صاحب کے ترجمہ کا ایک ایک لفظ بڑی احتیاط سے انتخاب کیا گیا ہے۔ شریف خان صاحب کے ترجمے کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں۔ شاہ صاحب کے ترجمہ کا ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح جڑا ہوا ہے، ان کے ترجمے کی زبان اور آج کل کی اردو میں بہت کم فرق ہے۔ شاہ صاحب کا سورۂ فاتحہ کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کی زبان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''سب تعریف اللہ کو ہے، جو صاحب سارے جہان کا، بہت مہربان نہایت رحم والا، مالک انصاف کے دن کا، تجھی کو ہم بندگی کریں اور تجھی سے ہم مدد چاہیں، چلا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی، جن پر تو نے فضل کیا، نہ وہ جن پر غصہ ہوا، اور نہ بہکنے والے۔''

اس ترجمہ میں ایک اصطلاح بھی متروک نہیں، بلکہ یہ سب اصطلاحیں آج بھی استعمال ہوتی ہیں.

صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

ومن خصائصه: أنه اختار لغة بحذاء لغة قاربت بما حازت في العموم والخصوص والإطلاق والتقييد، حتى إنها لاتتجاوزعنها في موارد الاستعمال، وتلك موهبة إلهية وكرامة ربانية يختص بها من يشاء. (۳)

شاہ صاحب کے ترجمے کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے ایک لغت کو دوسری لغت کے مقابلے میں یوں رکھا کہ عموم وخصوص اور اطلاق وتقیید میں وہ ایک دوسرے کے برابر ہوگئیں۔ یہاں تک کہ اس نے استعمال کے مقامات سے بھی تجاوز نہیں کیا، یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور کرامت ربانی ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس کے ساتھ خاص کرتا ہے۔

شاہ عالم بادشاہ کے دور میں ایک اور اردو ترجمہ ۱۸۰۲ء/ ۱۲۱۸ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر گل کرسٹ (م:۱۸۴۱) پرنسپل تھے۔ ان کے حکم پر علما کی ایک کمیٹی نے مل کر اس ترجمے کا کام کیا۔ مترجمین میں کاظم علی، امانت اللہ شیدا، میر بہادر علی، مولوی فضل اللہ اور غوث علی حافظ شامل تھے۔ اس کے سرورق پر لکھا ہے۔ ''ترجمہ قرآن شریف بزبان ہندی'' اور ایک مصرع لکھا ہے جس سے اس کی تاریخ ۱۲۱۸ھ نکلتی ہے۔ مصرع یہ ہے۔

صراط المستقیم الحق ہے بالکل

اس ترجمہ کا آغاز ۱۲۱۸ھ میں ہوا اور ایک سال کی مدت میں، یعنی ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس ترجمہ کی زبان کافی آسان اور پیچیدگیوں سے مبرا ہے۔

اٹھارویں صدی کے غیر مطبوعہ ترجموں میں محمد باقر فضل اللہ خیر آبادی کا ترجمہ بھی ملتا ہے۔ اس کا مخطوطہ حیدر آباد دکن میں نظام کالج کے پروفیسر حیدر حسین کی ملکیت ہے۔ قرآنی متن کے نیچے سرخ روشنائی سے اردو میں یہ ترجمہ لکھا گیا ہے خط بہت عمدہ ہے۔ زبان میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ لسانی لحاظ سے یہ ترجمہ متوسط درجہ کا ہے۔

اٹھارویں صدی کے ترجموں میں سے ایک اور قابل ذکر ترجمہ شاہ مراد اللہ انصاری نقشبندی سنبھلی کا ہے۔ انہوں نے اس کا نام ''تفسیر مرادیہ'' رکھا ہے۔ اس ترجمہ کی تکمیل کا سال ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰ء ہے۔ یہ ترجمہ اور تفسیر ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء ہوگی، کلکتہ میں طبع ہوا۔ پھر دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۴ء میں کلکتہ کے مطبع ستاریہ سے طبع ہوا۔ یہ تفسیر مرادیہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے ۲۱ سال قبل لکھی گئی۔

اس ترجمے اور تفسیر کا اسلوب عام فہم اور سلیس ہے۔ آج سے قریباً اڑھائی سو سال قبل لکھا ہوا

ترجمہ ادبی لحاظ سے کتنا شستہ ہے اس کا اندازہ سورۂ فاتحہ کے ترجمہ سے لگایا جاسکتا ہے:

''سب تعریف اللہ کو ہے جو رب ہے سارے جہان کا، بہت مہربان، نہایت رحم والا، مالک انصاف کے دن کا، تجھی کو ہم بندگی کریں اور تجھی سے مدد چاہیں، چلا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا نہ جن پر غضب ہوا اور بہکنے والے۔''

شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کا یہ ترجمہ بامحاورہ بھی ہے اور اس میں متن کے الفاظ کی ترتیب کا پورا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ ''الضآلین'' کا ترجمہ ''بہکنے والا'' کیا ہے۔ یہ ان کی علمیت کی دلیل ہے۔ آج کل کی طرح کے کیے کرائے ترجمے ان کے سامنے نہیں تھے، بلکہ ان کی انفرادی کوشش اور شخصی علمیت کا نتیجہ ہے۔

اس ترجمہ کے بارے میں مولانا محمد سالم قاسمی لکھتے ہیں:

''(یہ ترجمہ) زبان اٹھارویں صدی کے اواخر کی زبان کا اچھا اور مثالی نمونہ ہے۔ اس دور کی اردو نثر مقفّٰی اور مسجع ہوتی تھی مگر تفسیر مرادیہ کی زبان میں سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ اردو نثر کا یہ بالکل ابتدائی دور تھا اور اس وقت تک اردو نثر میں صرف چند ہی کتابیں لکھی جاسکی تھیں۔'' (۴)

ترجمہ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی:

اسی دور میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا، جو قدیم و جدید ترجموں میں ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ ان کا ترجمہ قرآن حکیم کے اردو ترجموں میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہ عبدالقادر کو قرآن حکیم سے ایک قلبی لگاؤ تھا اور انہوں نے برسہا برس اعتکاف کر کے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا۔ قرآن پر فکر و تدبر اور غور و خوض کیا۔ بتاتے ہیں کہ مسجد اکبر آبادی میں مسلسل چالیس سال وہ معتکف رہے اور اس عرصہ میں صرف قرآن پڑھتے، پڑھاتے اور اس پر غور و فکر فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنے مطالعہ اور غور و فکر کا عطر ''موضح قرآن'' کی صورت میں آئندہ آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کر دیا۔ ترجمہ اور تفسیر موضح قرآن مکمل کرنے کے بعد خود فرماتے تھے:

روز قیامت ہر کسے باخویش دارد نامۂ
من نیز حاضر می شوم تفسیرِ قرآن در بغل

قرآنی علوم آپ کو اپنے باپ دادا سے ورثہ میں ملے تھے۔ خصوصی طور پر آپ کے والد ماجد امام العصر شاہ ولی اللہؒ نے قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تا کہ جو لوگ عربی میں قرآن حکیم کو سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے وہ قرآن سے آشنا ہو سکیں۔ قرآن فہمی میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ اس فن میں آپ کی تصانیف میں الفوز الکبیر، فتح الخبیر اور قرآن حکیم کے ترجمہ کا ایک مقدمہ شامل ہے۔ پھر سلیس اور متعارف فارسی زبان میں لوگوں کے لیے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا جو ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس ترجمہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگ قرآن حکیم کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کو پڑھیں، سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کے اعمال درست کریں۔ چنانچہ شاہ صاحب خود لکھتے ہیں:

''اس کتاب (فتح الرحمٰن) کا مرتبہ متن قرآن اور فارسی کے مختصر رسائل پڑھنے کے بعد ہے تا کہ فارسی ان کی سمجھ میں بے تکلف آ جائے، خاص طور پر سپاہیوں اور اہل حرفہ کے بچوں کے لیے جو کہ علوم عربیہ کو پورا کرنے کی توقع نہیں رکھتے۔ سن تمیز کے پہلے ہی مرحلہ میں اس کتاب کی ان کو تعلیم دینی چاہیے تا کہ ان کے اندر پہلی چیز جو داخل ہو وہ کتاب اللہ کے معانی ہوں اور ان کی سلامتی فطرت ہاتھ سے نہ جائے۔'' (۵)

اپنی ایک اور کتاب الفوز الکبیر میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

''علم تفسیر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علوم مجھے بخشے گئے ہیں اور جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، انبیاء علیہم السلام کے قصوں کی تاویل ہے اور اس فقیر نے اس فن میں ایک رسالہ بنام ''تاویل الاحادیث'' لکھا ہے۔ نیز علوم وہبیہ میں سے ان پانچ علوم کی تنقیح ہے جن کے بارے میں قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ ہے، جو تخصیص اور تفہیم وغیرہ کی جنس سے انداز کلام میں عربی عبارت کے مشابہ ہے، جس کو ہم نے ''فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن'' میں درج کیا ہے۔'' (۶)

یہ ترجمہ شاہ ولی اللہؒ نے ۱۷۳۸-۱۷۳۷ء میں کیا، یعنی حج بیت اللہ سے واپس آنے کے قریباً

پانچ سال بعد۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر حضرت شاہ صاحبؒ ترجمہ قرآن کی یہ داغ بیل ڈال کر نہ جاتے تو قرآن حکیم عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے عوام کی دسترس سے باہر ہوتا اور عوام تو عوام ہیں انحطاط اور ناقدری کے اس زمانہ میں خود بہت سے ائمہ وخطباء کی آبرو کا تحفظ انہی ترجموں کی بدولت ہو رہا ہے۔ شاہ صاحبؒ کا نظریہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے جو بندے عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اپنے مالک وخالق سے براہ راست مخاطب بننے کی سعادت سے محروم ہیں، ان تراجم کی بدولت وہ بھی اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں اور اپنے رب کے کلام کو اپنی زبانوں میں پڑھ کر سمجھیں، اور جیسا کہ آپ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادرؒ نے لکھا ہے:

''بتانے والے بہتیرا بتائیں، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں۔''

شاہ ولی اللہؒ نے ترجمہ قرآن کے ضروری ہونے کو اپنے وصیت نامہ میں بھی درج فرمایا۔ چنانچہ آپ نے لکھا:

''قرآن عظیم درس گویند بآن صفت کہ صرف قرآں بخواند بغیر تفسیر ترجمہ گویند''

قرآن حکیم کا درس دینا چاہیے، اس طریقہ سے کہ صرف قرآن پڑھا جائے یعنی تفسیر کے بغیر متن قرآن اور ترجمہ پڑھایا جائے۔

قرآن حکیم کے ترجمہ کی یہ اہم خدمت جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے انجام دی۔ ان کے بعد ان کے تین صاحبزادگان، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے بھی قرآن کی اس خدمت کی تکمیل کی، جیسا کہ شاہ عبدالقادر نے موضح قرآن کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے زمانہ میں اردو عام طور پر لکھنے پڑھنے کی زبان نہیں تھی اس وجہ سے انہوں نے قرآن حکیم کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ان کے بڑے صاحبزادے سراج الہند شاہ عبدالعزیز نے بھی فارسی زبان میں تفسیر عزیزی کے نام سے قرآن حکیم کا ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ پھر جب اردو زبان نے قدم آگے بڑھایا تو پھر شاہ رفیع الدین نے لفظی ترجمہ اور شاہ عبدالقادرؒ نے بامحاورہ اردو میں قرآن حکیم کا ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ان دونوں حضرات کے بعد اس وقت تک قرآن حکیم کے جتنے بھی تراجم ہوے ہیں یا آئندہ ہوں گے، اس سنت حسنہ کے تسنن کا سہرا کم از کم ہندوستان میں خاندان

ولی اللّٰہی ہی کے سر بندھتا ہے۔ اس لحاظ سے ولی اللّٰہی خاندان ہندوستان میں ایک منفرد علمی خاندان ہے جس نے علم قرآن بلکہ علم نبوت کی مشعل کو اپنے خون جگر سے روشن کیا اور ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔'' کا محاورہ اس گھرانے پر صحیح صادق آتا ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خانؒ نے بالکل صحیح کہا ہے:

''شاہ ولی اللہ کا گھر ہندوستان میں علم دین کا گھر تھا۔ ان کے خاندان کے لوگ علوم عقلیہ ونقلیہ کے ہندوستان میں مشائخ تھے۔ اصحاب الصالحات اور ارباب الفضائل الباقیات تھے۔ ہندوستان کے کسی گوشہ میں کسی علمی گھرانہ نے علوم دینیہ کی اتنی خدمت نہیں کی جتنی شاہ ولی اللہؒ کے گھرانہ نے کی ہے۔(۷)

شاہ عبدالقادر کی پیدائش ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۳ء میں ہوئی۔ یہ شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب چونتیسویں پشت پر سیدنا عمر بن خطابؓ تک پہنچتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ اور برادر بزرگ شاہ عبدالعزیزؒ سے حاصل کی۔ قرآن، حدیث، فقہ میں مہارت تامہ پیدا کی اور تصوف وسلوک میں شاہ عبدالعدل دہلوی نقشبندیؒ کی تلمذی میں گیارہ سال رہے۔ کہتے ہیں کہ اردو زبان وادب میں خواجہ میر درد سے استفادہ کیا۔ آپ نہایت متقی، پرہیزگار اور خالص مرد مومن تھے۔ طبیعت پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ اولاد میں صرف ایک بیٹی تھی۔ قناعت وتوکل کا یہ عالم تھا کہ اپنی زندگی ہی میں اپنی ساری جائیداد اپنے بھائیوں، اپنی بیٹی اور اپنی نواسی کے شوہر شاہ اسماعیل شہید کے نام کردی۔ شاہ اسماعیل آپ کے شاگرد بھی تھے.

شاہ عبدالقادر کو فلسفہ، منطق اور معقولات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس وجہ سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ آپ معقولات سے یک قلم ناآشنا ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے امتحان لینے کی کوشش کی۔ جب بحث شروع ہوئی تو شاہ صاحب نے فلسفہ اور منطق کے وہ جوہر دکھائے کہ امتحان لینے والے شرمندہ ہو گئے۔ مخاطبین کو نادم دیکھ کر آپ نے فرمایا: ''تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقولات نہیں آتیں بلکہ ہم نے ان کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔''(۸)

آپ کے بے شمار شاگرد تھے جن میں شاہ اسماعیل شہید، شیخ عبدالحی، ہیبت اللہ بڈھانوی، فضل حق خیرآبادی، شاہ محمد اسحاق، شاہ احمد سعید اور مرزا حسن علی شافعی مشہور ہیں.

اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ قرآن نے آپ کو بھی آمادہ کیا کہ آپ اردو زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ کریں۔ ان کے زمانہ میں اردو ایک عام زبان ہو چکی تھی، لہٰذا ضروری تھا کہ اس زبان میں بھی قرآن حکیم کا ترجمہ ہو۔ آپ نے قرآن حکیم کا ترجمہ کرنے میں بڑی جرأت سے ایک نئی روش اختیار کی۔ جرأت اس لیے کہ اس سے قبل جب آپ کے والد ماجد نے فارسی زبان میں ترجمہ قرآن کیا تو اس وقت کے علما کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ مسلح ہو کر انہیں قتل کرنے کے لیے آ گئے کہ یہ قرآن حکیم کی بہت بڑی بے ادبی ہے۔ اس عظیم خدمت کے صلے میں آپ کو اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لیے کچھ عرصہ دہلی سے باہر جانا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے اردو زبان میں بامحاورہ قرآنی ترجمہ کی طرح ڈالی۔ ان کا ترجمہ اردو ادب کی شاہکار تصانیف میں سے ایک ہے۔ آج سے قریباً دو اڑھائی سو سال قبل اردو ادب کی نثر کے معیاری نمونہ کی بہترین مثال ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ عمر میں شاہ رفیع الدین اپنے بھائی شاہ عبدالقادر سے چار سال بڑے تھے، لیکن عموماً لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ شاہ رفیع الدین صاحب نے ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر سے پہلے کیا تھا، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ شاہ عبدالقادر نے ترجمہ قرآن پہلے کیا اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب نے ترجمہ بعد میں کیا۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر کے فوائد ''موضح قرآن'' کے ساتھ کلکتہ کے ایک قدیم مطبع اسلامی پریس میں طبع ہوا۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تھا۔

عربی زبان میں جملے کی ترتیب اردو زبان سے بالکل مختلف ہے، جب ہم عربی کے کسی جملے کا لفظی ترجمہ کرنا چاہیں تو اردو میں جملہ کچھ بے ہنگم سا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مختصر ترین جملہ ہے "جاء احمد" اس کا لفظی ترجمہ ہے ''آیا احمد۔'' اور بامحاورہ ترجمہ ہے ''احمد آیا۔'' اس میں پہلا لفظ آخری ہو گیا اور آخری لفظ پہلا ہو گیا۔ اسی طرح جملہ جتنا طویل ہوگا، اتنا ہی اس کی اردو ترتیب میں منطق اور عقل دونوں سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ مفہوم سمجھنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے اس بات کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا اور تحت اللفظ ترجمہ کی گرانی فہم کو محسوس کیا، چنانچہ انہوں نے بامحاورہ ترجمہ کی بنیاد ڈالی۔ قرآن حکیم کے بامحاورہ ترجمہ کو علما شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن شاہ عبدالقادر نے بڑی جرأت اور ہمت سے اس ذمہ داری کو نہایت خوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان کا

یہ بامحاورہ ترجمہ نہایت مستند، ثقہ اور صحیح ترجمہ ہے۔ لسانی اعتبار سے اس قدر عمدہ ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ دوسو سال قبل اتنا سادہ لیکن ادبی ترجمہ ظہور پذیر ہوا۔ اسلوب اتنا طبعی اور پر اثر کہ زمانہ جدید کے بعض تراجم سے بہتر۔ اسلوب بیان کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الانعام کی یہ آیت:

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَآئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْساً إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْراً قُلِ انْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ﴾(۹)

''کاہے کی راہ دیکھتے ہیں لوگ، مگر یہی کہ ان پر آویں فرشتے، یا آوے تیرا رب، یا آوے کوئی نشان تیرے رب کا؟ جس دن آوے گا ایک نشان تیرے رب کا، کام نہ آوے گا ایمان لانا کسی کا، جو پہلے سے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی تھی، تو کہہ، راہ دیکھو، ہم بھی راہ دیکھتے ہیں۔''

ملاحظہ فرمائیں کہ مندرجہ بالا آیت کا کس سلاست اور آسانی سے ترجمہ کر دیا۔ یہ سہل ممتنع نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن حکیم تحریر کی شکل میں نہیں، بلکہ تقریر یا خطاب کی شکل میں رسول اللہؐ پر نازل ہوا تھا۔ قرآن حکیم کی اس روح کو شاہ عبدالقادرؒ نے کتنی خوبی سے قائم رکھا ہے۔ ایک اور آیت کا ترجمہ مثال کے طور پر درج کیا جاتا ہے:

﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ﴾(۱۰)

''اللہ کشادہ کرتا ہے روزی جس کو چاہے اور تنگ، اور وہ ریجھے ہیں دنیا کی زندگی پر، اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے حساب میں مگر تھوڑا برتنا۔''

مندرجہ بالا ترجمہ میں ''فَرِحُوْا'' کا ترجمہ ''ریجھے'' کیا ہے۔ یہاں لفظ ریجھے نہایت برمحل اور موزوں ہے۔ یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر کی عبقریت اور علمیت کا مکمل ثبوت ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ جب قرآن حکیم کے ترجمہ سے فارغ ہوئے تو لوگوں کے اصرار پر قرآن حکیم کے حواشی لکھنا شروع کیے۔ یہ فوائد یا مختصر تفسیر ہے۔ اس کا تاریخی نام ''موضع قرآن'' ہے جس سے سن

ہجری ۱۲۰۵ھ نکلتا ہے۔ اس وقت سن عیسوی ۱۷۹۰ء تھا۔ بعض حضرات اس مختصر تفسیر کو ''موضح القرآن'' لکھتے ہیں جو کہ غلط ہے، صحیح ''موضح قرآن'' ہے کیونکہ اسی سے تاریخ یعنی ۱۲۰۵ھ نکلتی ہے۔

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ سید عبداللہ بن سید بہادر علی نے دہلی کے مطبع احمدی میں طبع کروایا تھا۔ اس ایڈیشن میں طباعت کی تاریخ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء لکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تھا۔ پہلی جلد سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الکہف تک اور دوسری جلد سورۂ مریم سے سورۃ الناس تک ہے۔ ''موضع قرآن'' کے ساتھ پہلی مرتبہ دہلی کے مطبع احمدی میں ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء میں یہ ترجمہ طبع ہوا۔

ترجمہ کی سلاست اور شاندار اسلوب نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ اس ترجمہ کا پشتو زبان میں ترجمہ مولانا فتح اللہ قندہاری نائب مفتی ریاست بھوپال نے کیا اور ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء میں بھوپال کے مطبع اسکندری سے طبع کروایا۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ اور تفسیر کے متعدد ایڈیشن برصغیر پاک و ہند میں طبع ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس میں تاج کمپنی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے مختلف ایڈیشن مختلف حجم میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ طبع کیے۔

یہ اس ترجمہ کی خوبی اور حسن اسلوب تھا کہ اس ترجمہ کے قریباً ۱۲۰ سال بعد دارالعلوم دیوبند کے ایک فرزند اور ولی اللہی بزرگ یعنی شاہ ولی اللہ کے صحیح جانشین حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند نے جیل کی چار دیواری میں بیٹھ کر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالقادر وغیرہ کی اس سنت کو جاری رکھا۔ چنانچہ مفتی محمد شفیع قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ایک روز شیخ الہند محمود حسنؒ نے فرمایا کہ ہم نے مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں، یہ الفاظ جونہی آپ کے منہ سے نکلے سارے حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے کہ اس استاذ العلما درویش نے ۸۰ سال علما کو درس دینے کے بعد آخری عمر میں جو دو سبق سیکھے ہیں، وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور و خوض کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں؟ اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا اور دوسرا آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن حکیم کو لفظاً اور معناً

عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کیے جائیں، اور بڑوں کو عوامی درس کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے، اور قرآنی تعلیم پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''نباض امت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی باقی ایام زندگی میں ضعف اور علالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعی پیہم فرمائی۔ بذات خود درس قرآن شروع کرایا جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے علما بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی۔'' (۱۲)

اس ترجمہ سے متاثر ہو کر اور ان جذبات کے تحت جو حضرت مفتی شفیع صاحب کی زبان سے آپ سن چکے ہیں، حضرت شیخ الہند نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر اپنا ترجمہ لکھا۔ وہ شاہ صاحب کے ترجمہ سے بے حد متاثر تھے۔ دراصل شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ ہے ہی قابل ہزار ستائش کہ مولانا محمود حسنؒ جیسے جید عالم اس کے مداح تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب کے اس ترجمہ کے بارے میں جو کچھ مدح سرائی کی ہے، اس کے چند اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

''ترجمہ میں اختصار و سہولت اور الفاظ قرآنی کی لفظی اور معنوی موافقت، اور صرف لغوی معنی پر بس نہیں، بلکہ معنی مرادی اور غرض اصلی کا ہر موقع پر بہت لحاظ رکھتے ہیں اور ترجمہ میں کبھی ایسا لفظ لاتے ہیں جس کی وجہ سے اگر کسی قسم کا اجمال اور اشکال ہو تو زائل ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں اور دوسری جگہ کچھ، حالانکہ لغوی معنی اس لفظ کے ایک ہی ہیں، مگر ہر مقام کے مناسب جدا جدا عنوان سے بیان فرماتے ہیں۔''

مولانا محمود حسنؒ مزید فرماتے ہیں:

''ترجمہ موصوف جملہ تراجم میں ممتاز اور مفید تر نظر آتا ہے اور بنظر فہم وانصاف اس کا مستحق ہے کہ سہل ممتنع کے ساتھ ملقب ہو۔ یہ حضرت ممدوح کا کمال ہے کہ ہر موقع پر جملہ امور پیش

نظر رہتے ہیں، اور ترجمہ میں حسب حاجت ان کی رعایت کرتے ہیں، اور اسی کے مطابق الفاظ بھی ان کو بسہولت مل جاتے ہیں۔ گویا محاورات ولغات اردو بھی سب سامنے رہتے ہیں جس کو مناسب سمجھا بے تکلف لے لیا اور اس پر ترجمہ اپنے محدود احاطہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شاہ عبدالقادر جو با محاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں، یہی وجہ ہے جو اسلاف ممدوحین کے بعد اس زمانے میں جس نے اس میدان میں قدم رکھا اس نے جناب شاہ صاحب ممدوح کا اتباع کیا اور با محاورہ ترجمہ کرنے کو اختیار کیا جس پر کسی کا شعر یاد آتا ہے۔

ہر مرغ کہ پرد بہ تمنائے اسیری
اول بشگوں کرد طواف قفس ما

حضرت شیخ الہندؒ اس بارے میں مزید فرماتے ہیں:

''اور یہ امر بھی خوب معلوم ہوگیا کہ جیسے حضرت شاہ رفیع الدینؒ کا یہ کمال ہے کہ تحت لفظی ترجمہ کا التزام کر کے ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ایسے ہی حضرت مولانا عبدالقادرؒ کا یہ کمال ہے کہ با محاورہ ترجمہ کا پورا پابند ہو کر پھر نظم و ترتیب کلمات قرآن اور معانی لغویہ کو اس حد تک بنایا ہے کہ زیادہ کہتے ہوئے تو ڈرتا ہوں مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ہم جیسوں کا ہرگز کام نہیں۔ اگر ہم ان کے کلام کی خوبیوں کو اور ان اغراض اور اشارات کو جو ان کے سیدھے سادھے مختصر الفاظ میں ہیں، سمجھ جائیں تو ہم جیسوں کے فخر کے لیے یہ امر بھی کافی ہے۔''

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب ترتیب قرآنی کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اصل اور ترجمہ کی مطابقت میں بہت زیادہ سعی فرماتے ہیں، مگر چونکہ ترجمہ با محاورہ کا التزام کیا ہے، اس لیے بضرورت توضیح و تسہیل بعض مواقع میں تقدیم و تاخیر لازم ہے، مگر جیسا کہ آٹے میں نمک۔ یہ نہیں کہ آخر کا ترجمہ اول اور اول کا آخر ہو جائے۔ الغرض فصل بعید سے احتراز رکھتے ہیں الا ماشاء اللہ۔ کسی خاص ضرورت کے وقت میں دو تین کلموں کا فصل ہو جائے اور وہ بھی نادر کالمعدوم۔ دیکھیے عربی زبان میں مضاف کو مقدم

ذکر کرتے ہیں اور اردو کا محاورہ یہ ہے کہ مضاف الیہ کو مقدم کرتے ہیں، شاہ صاحب کے ترجمہ میں اس قسم کی مثالیں کثرت سے ملیں گی مثلاً "عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی أَبْصَارِهِمْ" کا بامحاورہ ترجمہ کریں گے تو "ان کے دل پر اور ان کے کان پر اور ان کی آنکھوں پر" کیا جائے گا اور ترجمہ تحت لفظی میں "اوپر دلوں ان کے کے، اور اوپر کانوں ان کے کے، اور اوپر آنکھوں ان کے کے" کہنا پڑے گا، مگر سب جانتے ہیں کہ ایسے اختلاف جتنے بھی ہوں ان میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ضروری ہیں، بامحاورہ ترجمہ کرنے والے کو اس سے مضر نہیں، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی احتیاط قابل تحسین اور لائق قدر ہیں کہ اس پر بھی ہر جگہ مضاف الیہ کو مقدم نہیں کرتے بلکہ جہاں ترجمہ میں ذرا گنجائش مل جاتی ہے وہاں اتنے قلیل تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے، ترتیب قرآنی کو بھی اختیار فرماتے ہیں۔ دیکھو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" میں چونکہ رب العالمین مضاف مضاف الیہ مل کر صفت واقع ہوے ہیں، اس کے ترجمہ میں یہ گنجائش نکل آئی کہ ترجمہ محاورہ کے خلاف بھی نہ ہو اور کلام الٰہی کی ترتیب بھی باقی رہے، اس لیے "رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" کا ترجمہ اصلی ترتیب پر رکھا اور "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" بھی صفت واقع ہوا ہے مگر اس میں دو اضافتیں مجتمع ہیں، اول اضافت میں اصلی ترتیب باقی رکھنے کی گنجائش ہے دوسری اضافت میں نہیں، اس لیے ترجمے میں "مالک" کا ترجمہ اصل کے موافق مقدم رکھا اور "یوم" کے ترجمے کو محاورہ اردو کے موافق "دین" سے مؤخر کر دیا، چنانچہ سب پر ظاہر ہے، اس میں کسی کو تردد نہیں، صرف توضیح اور تسہیل کی غرض سے ہم نے عرض کر دیا، لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں کہ وہاں محاورۂ اردو کے ساتھ ترتیب قرآن کا لحاظ رکھنا دشوار ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان مقامات میں بھی اپنی غائر اور باریک بین نظر سے ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں کہ محاورہ کی پابندی کے ساتھ ترتیب بھی باقی رہے، یا فرق آئے تو خفیف ولطیف۔

بعینہ یہی حال فعل اور فاعل اور مفعول اور جمیع متعلقات فعل کا، اور صفت موصوف، حال تمیز وغیرہ کا کہ اکثر مواقع میں ترتیب کی موافقت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں اسی تغیر لطیف مذکورہ بالا سے کام لیتے ہیں۔

اور سنیئے، حروف روابط جن کو حروف جر بھی کہتے ہیں جیسے ل، ب، علیٰ، الیٰ، من، عن، فی بہت کثرت سے مستعمل ہیں، مگر کلام عرب میں یہ حروف ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں اور ہمارے

محاورہ میں علی العموم مؤخر بولے جاتے ہیں مگر شاذ و نادر، لیکن ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کا مؤخر ہونا ضروری ہے۔ ہماری زبان میں ان کو مقدم لانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں جیسے مِنْ اور عَنْ۔ سب کو معلوم ہے کہ "مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ" کے ترجمے میں اردو زبان کے اندر ممکن نہیں کہ "من" کا ترجمہ مقدم ہو سکے اور ترتیب قرآنی کی موافقت کی جا سکے۔ ایسے ہی "لَاتَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ" کے ترجمہ میں کوئی صورت نہیں کہ "عَنْ" کا ترجمہ نفس کے ترجمہ سے مقدم ہو سکے۔ اسی وجہ سے تحت لفظی ترجمہ میں بھی یہ تغیر گوارا کرنا ہوتا ہے، اور اس میں کسی کو تامّل نہیں ہو سکتا، اور بعض ایسے ہیں کہ ان کو مقدم کرنا تو درست ہے مگر محاورہ کے خلاف ہے۔ سو تحت لفظی ترجمہ میں ان کو نظم قرآنی کے موافق مقدم لا سکتے ہیں، مگر با محاورہ ترجمہ کے لیے ان کو بھی مؤخر کرنا ضروری ہوگا جیسے علیٰ، الیٰ وغیرہ حروف مذکورہ دیکھئے "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" کے تحت لفظی ترجمہ میں "مہر کر دی اللہ نے اوپر دلوں ان کے کے" کہنا مناسب ہوگا، اور با محاورہ ترجمہ میں "مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر" کہنا ٹھیک سمجھا جائے گا۔ پہلی صورت میں لفظ اپنی اصلی ترتیب پر رہا۔ دوسری صورت میں تھوڑا سا بقدر ضرورت اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اسی پر دیگر حروف کو قیاس فرما لیجیے۔ سو اول تو یہ حروف فی نفسہ غیر مستقل اور دوسروں کے تابع ہیں۔ ان کا تقدم تاخر چندان قابل اعتبار نہیں۔ دوسرے بے وجہ نہیں بلکہ ضرورت اور حاجت اور نفع کی وجہ سے کرنا ہوا۔ تیسرے اتنا لطیف و خفیف کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی بعض مواقع میں قابل قبول اور ضروری سمجھا جاتا ہے، ان سب کے بعد پھر وہی بات ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں، یعنی جہاں کچھ گنجائش نکل آئی ہے وہاں حضرت شاہ صاحب اس خفیف قابل قبول تغیر کو بھی چھوڑ کر اعلیٰ ترتیب کو قائم رکھتے ہیں اور ایسا ترجمہ کرتے ہیں جو ترتیب قرآنی کی پابندی کے ساتھ محاورہ کے بھی مخالف نہ ہونے پائے۔ اس کی مثالیں حروف مذکورہ کے متعلق جگہ جگہ موجود ہیں، مثلاً "اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ" کا ترجمہ فرمایا ہے "مگر انہی پر جن کے دل پگھلے ہیں۔" یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں، دیکھ لیجئے لفظ "علی" کے ترجمہ کو مقدم رکھا "خاشعین" پر اور محاورہ کے مخالف بھی نہ ہوا۔ (۱۴)

حضرت شیخ الہندؒ اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کی خوبیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ اس ترجمہ کی خوبیوں کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں اور

دوسری جگہ کچھ، گویا وہ ہر مقام کے مناسب جدا جدا عنوان سے ترجمہ فرماتے ہیں جس سے قرآنی مراد سمجھنے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ اسی آسانی کی وجہ سے وہ کبھی ایجابی مضمون کو سلبی عنوان سے ادا کرتے ہیں، اور اکثر مواقع میں نفی اور استثنا کا جدا جدا ترجمہ کرتے ہیں، بلکہ حصر جو اس سے مقصود ہے اس کو مختصر ہلکے لفظوں میں محاورہ کے موافق بیان کر جاتے ہیں۔ آپ نے چھوٹے بڑے کئی فوائد کی طرف ہر موقع پر پوری توجہ فرمائی ہے اور ترجمہ میں ہر موقع پر اس کا پورا پورا اہتمام کیا ہے، اس وجہ سے یہ ترجمہ تمام تراجم میں ممتاز اور مفید نظر آتا ہے اور اس کو سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔ **بارک اللہ فی حسناته و أفاض علینا من برکاته**

یہ بات نہایت قابل قدر ہے کہ حضرات مفسرین اور شراح حدیث کے مبسوط و طویل ارشادات کا خلاصہ اس ترجمہ اور تفسیر میں چند الفاظ میں سمجھا دیا گیا ہے۔ اس کی مثالیں ان کے ترجمہ میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ "بِسْمِ اللّٰہ" کا ترجمہ محاورہ کے مطابق کیا جس میں توضیح اور اختصار دونوں کی بقدر مناسب رعایت رکھی گئی ہے۔ اس سے بہتر اور خوبصورت ترجمہ اردو زبان میں سمجھ میں نہیں آتا۔ اور رحمان اور رحیم جو مبالغہ کے صیغے ہیں، ان کے مبالغہ کو بھی ترجمہ میں ظاہر فرما دیا اور ایک لطیف اشارہ بھی ان کے فرق مراتب کی طرف بھی کر دیا، اس کے بعد سورۃ فاتحہ میں بھی رحمٰن اور رحیم کا ترجمہ ایسا ہی کیا گیا۔ "یوم الدین" کا ترجمہ تمام حضرات نے "روز جزا" یا "دن جزا کا" کیا ہے، مگر حضرت شاہ صاحب نے صاف لکھ دیا ہے کہ میں نے عوام کی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اور عوام کی زبان میں جزا کا دن مستعمل نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہل لغت اور مفسرین نے "دین" کے معنی جزا اور حساب دونوں بیان کیے ہیں۔ اس وجہ سے غالباً حضرت شاہ صاحب نے جزا کے بدلے "انصاف" کا لفظ استعمال فرمایا ہے کیونکہ یہ عوام میں زیادہ مستعمل ہے، چنانچہ اس ایک لفظ میں جزا اور حساب دونوں آ گئے۔

"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" میں تمام حضرات نے لفظ ہدایت سے کیا ہے کیونکہ ہدایت کا لفظ عربی اور فارسی وغیرہ میں عام استعمال ہوتا ہے اور کبھی ہدایت کا ترجمہ "راستہ دکھانے" اور راہ نمائی کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن حضرت شاہ صاحب "ہدایت" کا ترجمہ اپنی ہی زبان میں فرماتے ہیں، الا ماشاء اللہ، لیکن ہر موقع پر اس بات کا لحاظ بھی فرماتے ہیں کہ "ہدایت" کے کون سے معنی اس موقع کے مناسب ہیں، کیونکہ "ہدایت" کے معنی لغت عرب میں دو ہیں۔ ایک صرف راستہ دکھلا دینا اور

دوسرے مقصود تک پہنچا دینا۔ اول معنی کو ''اراءت'' اور دوسرے کو ''ایصال'' کہتے ہیں۔ اس لیے دوسرے مترجمین نے ''اِهْدِنَا'' کا ترجمہ ''دکھا ہم کو'' فرمایا ہے، جب کہ حضرت شاہ صاحب ''چلا ہم کو'' فرماتے ہیں۔ جس سے ''ایصال'' کی طرف اشارہ کرنا مفہوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کا ترجمہ دوسرے حضرات نے ترجمہ میں ''رہنما'' یا ''راہ دکھائی ہے'' فرمایا ہے جب کہ شاہ صاحب نے ''راہ بتلائی ہے'' فرمایا ہے۔ چونکہ ''اِهْدِنَا'' میں ''ہدایت'' حق تعالیٰ کی صفت ہے، لہٰذا وہاں چلانے کا لفظ لائے ہیں اور اس موقع پر ''ہدایت'' قرآن کی صفت ہے، اس لیے ترجمہ ''راہ بتانے'' کا لفظ بیان کیا ہے۔ ورنہ دونوں جگہ مقصود ایصال کی طرف اشارہ کرنا معلوم ہوتا ہے۔ **فرحمه الله ماادق نظره وادق الفاظه۔**

''متقین'' میں تقویٰ کا ترجمہ سب حضرات نے ''پرہیزگاری'' کیا ہے، لیکن حضرات مفسرین نے اس پر ایک اشکال یہ وارد کیا کہ ہدایت کے محتاج تو گمراہ ہیں نہ کہ متقی، اس لیے ''هُدًى لِّلضَّآلِّيْن'' فرمانا چاہیے تھا۔ بعض حضرات نے ''متقین'' کے معنی ''صَائِرِيْنَ اِلَى التَّقْوٰى'' کے لے کر جواب دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی طبع لطیف اور باریک بین نظر اس طرف گئی کہ تقویٰ کا ترجمہ ''ڈر'' اور ''خوف'' کے ساتھ کرنا پسند فرمایا جو تقویٰ کے اصلی اور لغوی معنی ہیں اور ''مُتَّقِيْن'' سے وہ لوگ مراد لیے، جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، اس لیے ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کا ظاہر اور معروف ترجمہ یعنی ''راہ دکھائی ہے پرہیزگاروں کو'' اس کو چھوڑ کر ''راہ بتلائی ہے ڈر والوں کو'' اختیار کیا جس سے مذکورہ بالا شبہ کا خود بخود ازالہ ہو گیا۔

''يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ'' کے ترجمہ میں اگر ''ایمان لائے ہیں ساتھ غیب کے'' یا ''غیب پر'' کہا جائے تو بہت صحیح اور ظاہر کے موافق ترجمہ ہے۔ لیکن اس پر کئی اشکال وارد ہوتے ہیں، مگر شاہ صاحب نے جو ترجمہ کیا اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ آپ نے ترجمہ فرمایا: ''یقین کرتے ہیں، بن دیکھے۔'' اس سے ایک تو ایمان کے معنی متعین ہو گئے، یعنی یقین اور دوسرے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غیب کے معنی ہیں کہ جن چیزوں کو انہوں نے نہیں دیکھا، ان کے علم اور ادراک سے غائب ہیں، جیسے جہنم، جنت، پل صراط، وزن اعمال وغیرہ، سو وہ لوگ ان سب چیزوں کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے یقین کرتے ہیں۔ اس مطلب اور ترجمہ سے تمام اشکال دور ہو جاتے ہیں جو حضرات مفسرین نے بیان کیے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ترجمہ پر یہ تبصرہ قریباً ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تحت اللفظ ترجمہ کا نہ صرف رواج تھا، بلکہ عام علما کا یہ عقیدہ تھا کہ ترتیب الفاظ قرآن کو ترجمہ میں بھی بدلنا ایک نہایت غلط بات ہے، اس لیے ترجمہ کرنے والے حضرات کی اکثر و بیشتر یہی کوشش ہوتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے ہر عربی لفظ کا ترجمہ اسی کے نیچے مترادف اردو لفظ میں کیا جائے۔ شاہ عبدالقادر نے بڑی جرأت سے ترتیب الفاظ قرآنی کے ترجمے میں کچھ ردوبدل معنی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اسی لیے ان کے ترجمہ کو پہلا بامحاورہ ترجمہ کہا جاتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ ایک ممتاز عالم دین، مجدد اور مترجم قرآن تھے، لہٰذا ان کی شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی مدلل اور جامع طریقے سے تعریف کرنا شاہ عبدالقادر کی عربی دانی، عرفان علوم قرآن اور اردو زبان پر عبور اور ان کی بے پناہ علمیت اور فکر کی نزاکت کا ثبوت ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ شاہ صاحب کے ترجمہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''شاہ عبدالقادر کے ترجمے اور حواشی کی خوبی کا اصلی اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے خود قرآن حکیم کو سمجھنے کی تھوڑی بہت کوشش کی ہے''۔

سرسید احمد خان جنہوں نے خود بھی قرآن حکیم کا ترجمہ کیا ہے، اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' میں حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کا ترجمہ کلام اللہ کا، اردو لغات کے لیے ایک بڑی سند ہے۔'' (۱۵)

علامہ انور کشمیریؒ اپنے شاگردوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ شاہ صاحب کا ترجمہ دیکھو اور بعض مسائل جو تفسیر سے حل نہیں ہوتے وہ اس ترجمے سے حل ہو جاتے ہیں۔ (۱۶)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں اس قدر پابندی نہیں کی گئی، بلکہ وہ مفہوم کی صحت اور لفظ کے حسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اردو زبان کے روزمرہ اور محاورہ کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ دوسری خوبی ان کے ترجمہ میں ایجاز کی ہے، یعنی وہ ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں مفہوم صحت کے ساتھ ادا ہو جائے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ دوسرے ترجموں کے مقابلہ میں اس قدر بہتر اور افضل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس

کے ہوتے ہوئے چند سالوں بعد دوسرے ترجموں کی ضرورت کیوں سمجھی گئی۔''

اس اقتباس میں مولوی عبدالحق بابائے اردو نے شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کی جو تعریف کی ہے وہ بالکل درست ہے، لیکن مولوی عبدالحق کا یہ اعتراض سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے ترجمہ کے چند سال بعد قرآن کے اردو ترجمے کیوں کیے گئے۔ کیا ڈاکٹر صاحب کو یہ نہیں معلوم کہ علم کی کوئی انتہا نہیں ۔

شاہ صاحبؒ ترجمہ و تفسیر ''موضح قرآن'' مکمل کرنے کے بعد خود فرمایا کرتے تھے:

روز قیامت ہر کسے باخویش دارد نامۂ من نیز حاضر میشوم تفسیر قرآں در بغل

وكانت وفاته يوم الأربعاء لتسع عشرة خلون من رجب سنة ثلاثين ومائتين وألف بدهلي فدفن عندوالده، وكان الشيخ عبدالعزيز ورفيع الدين لاتزال بقيد الحياة، فكان يوم موته من أنحس الأيام عليهما وكانا يقولان عند دفنه:

((إنا لاندفن الإنسان بل ندفن العلم والعرفان)) (۱۷)

''ان کی وفات بروز بدھ ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ کو دہلی میں ہوئی اور اپنے والد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ اس موقع پر شیخ عبدالعزیز اور شیخ رفیع الدین با قاعدہ حیات تھے ان کی وفات کا دن ان دونوں حضرات کے لیے انتہائی منحوس دن تھا ان کے دفن کے موقع پر ان حضرات نے فرمایا تھا:

ہم نے انسان کو دفن نہیں کیا، بلکہ علم و عرفان کو دفن کیا ہے۔''

مراجع ومصادر

1- عجائب الہند، مطبوعہ لائیڈن: ص۲

2- دیباچہ قرآن کریم: ص۵

3- نزہۃ الخواطر: ۷/ ۳۲۷

4- تذکرہ تراجم قرآنی: ص۱۹۔۲۰، مطبوعہ دیوبند

5- فتح الرحمٰن مقدمہ

6- الفوز الکبیر: ص۱۲۰، برحاشیہ سفر السعادت

7- ابجد العلوم: ۳/ ۲۴۳

8- شاہ عبدالقادر کی قرآن فہمی، فاروق احمد خان: ص۱۴

9- الانعام: ۱۵۸

10- الرعد: ۲۶

11- قرآن حکیم کے اردو تراجم: ص۱۷۵

12- وحدت امت: ص۵۱

13- مقدمہ، موضح الفرقان: ص۴

14- قرآن حکیم کے اردو تراجم: ص۱۷۱

15- آثار الصنادید: ص۲۶۲

16- مقدمہ ترجمہ قرآن مولانا احمد علیؒ

17- نزہۃ الخواطر: ۷/ ۳۲۸

☆ ☆ ☆